



سید عابد حسین

(1896 – 1978)

ڈاکٹر سید عابد حسین کا وطن داعی پور، ضلع فرخ آباد (اتر پردیش) تھا۔ عابد حسین کی پیدائش بھوپال (مدھیہ پردیش) میں ہوئی، جہاں اُن کے دادا اور والد ملازمت کرتے تھے۔ سید عابد حسین کی والدہ کا تعلق لکھنؤ کے ایک تعلقہ دار گھرانے سے تھا۔ اُن کا بچپن داعی پور اور لکھنؤ میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں اور ثانوی تعلیم بھوپال میں حاصل کی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم آکسفورڈ یونیورسٹی، برطانیہ اور برلن یونیورسٹی، جرمنی میں حاصل کی۔ سید عابد حسین نے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ جرمنی سے واپس آ کر ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام کرنے لگے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عابد حسین تصنیف و تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔ انھوں نے سب سے پہلے 1926 میں ایک ڈراما ”پردہ غفلت“ لکھا۔ جرمن زبان کی کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جن میں گوٹے کی ”فاؤسٹ“ سب سے اہم ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے مہاتما گاندھی کی خودنوشت کا ترجمہ ”تلاشِ حق“ کے نام سے اور پنڈت جواہر لعل نہرو کی ڈسکوری آف انڈیا کا ترجمہ ”تلاشِ ہند“ کے نام سے اردو میں کیا۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں ”قومی تہذیب کا مسئلہ“ اور ”ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں“ اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں۔ انھوں نے اردو کے علمی سرمایے میں قابل قدر اضافہ کیے۔ وہ دو مشہور جرائد ”اسلام اور عصر جدید“ اور ”اسلام اینڈ دی موڈرن ایج“ کے بانی مدیر بھی رہے۔ چوری اور اس کا کفارہ، گاندھی جی کی آپ بیتی کے اردو ترجمے سے ماخوذ ہے۔

چوری اور اس کا کفارہ

ہائی اسکول میں جن لڑکوں سے مجھ سے مختلف اوقات میں دوستی رہی ان میں سے دو قلبی دوست کہے جاسکتے ہیں۔ ایک سے میری دوستی زیادہ دن نہیں رہی۔ میں نے اُسے نہیں چھوڑا بلکہ اُس نے مجھے چھوڑ دیا، اس قصور پر کہ میں نے دوسرے سے میل جول پیدا کیا۔ اس دوسری دوستی کو میں اپنی زندگی کا ایک الم ناک واقعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بہت دن قائم رہی۔ میں نے اسے اصلاح کے جوش میں شروع کیا تھا۔

میرا یہ رفیق اصل میں میرے مٹھلے بھائی کا دوست تھا۔ یہ دونوں ہم سبق تھے۔ میں اس کی کمزوریوں سے واقف تھا، مگر اسے وفادار دوست سمجھتا تھا۔ میری ماں نے، میرے بڑے بھائی نے، میری بیوی نے مجھے متنبہ کیا کہ تمہاری صحبت خراب ہے۔ بیوی کی بات تو میں شوہر کے غرور میں کب سنتا تھا، لیکن ماں اور بڑے بھائی کی رائے کے خلاف عمل کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ پھر بھی میں نے اُن سے عذر معذرت کی اور کہا ”میں جانتا ہوں کہ اس میں وہ کمزوریاں ہیں جو آپ نے بتائیں مگر آپ کو اس کی اچھائیوں کی خبر نہیں۔ وہ مجھے گمراہ نہیں کر سکتا کیوں کہ میں اس سے اس نیت سے ملتا ہوں کہ اس کی اصلاح کروں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اپنے اطوار درست کرے تو بڑا اچھا آدمی ہو جائے گا۔ میری التجا ہے کہ آپ میری طرف سے تڑد نہ کریں۔“

اس سے اُن کا اطمینان تو نہیں ہوا مگر انہوں نے میری توجیہ مان لی اور مجھے میری راہ چلنے دیا۔ آگے چل کر مجھے معلوم ہوا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ جو شخص کسی کی اصلاح کرنا چاہتا ہے وہ اُس کے ساتھ شہر و شکر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ سچی دوستی روحانی اتحاد کا نام ہے جو اس دنیا میں بہت کم ہوتا ہے۔ صرف اُن ہی لوگوں میں جن کی طبیعت ایک سی ہو، دوستی پوری طرح مکمل اور پائیدار ہو سکتی ہے۔ دوستوں میں ہر ایک کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے، اسی لیے دوستی میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے۔ میری رائے میں کسی ایک شخص سے ایک جان دو قالب ہو جانے سے پرہیز کرنا چاہیے، کیوں کہ انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے اور جو شخص خدا کا دوست ہونا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ یا تو اکیلا رہے یا ساری دنیا سے دوستی کرے۔ ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو، مگر مجھے تو قلبی دوستی پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔

جن دنوں میں میری ملاقات اس دوست سے ہوئی، راج کوٹ میں ”ریفارم“ کا بڑا زور تھا، اس نے مجھے بتایا کہ ہمارے

بہت سے استاد چھپ کر شراب اور گوشت کا استعمال کرتے ہیں۔ اس نے راج کوٹ کے بہت مشہور آدمیوں کے نام بھی لیے جو اس جماعت میں شریک تھے۔ اس نے کہا کہ اس زمرے میں ہائی اسکول کے بعض لڑکے بھی ہیں۔

مجھے یہ سن کر تعجب اور رنج ہوا۔ میں نے اپنے دوست سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے کہا ”ہماری قوم گوشت نہیں کھاتی اس لیے کمزور ہے۔ انگریز لوگ گوشت کھاتے ہیں، اسی لیے وہ ہم پر حکومت کرنے کے قابل ہیں۔ تم جانتے ہو میں کیسا مضبوط ہوں اور کتنا تیز دوڑتا ہوں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ میری غذا گوشت ہے۔ گوشت کھانے والوں کے پھوڑے پھنسی نہیں نکلتے اور کبھی نکل بھی آئیں تو جلد اچھے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے استاد اور ہمارے دوسرے بڑے آدمی جو گوشت کھاتے ہیں، احمق نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں کیا خوبیاں ہیں۔ تمہیں بھی اس کی تقلید کرنا چاہیے۔ آخر آزمائش کرنے میں کیا حرج ہے۔ تم آزما کر دیکھو کہ گوشت کھانے سے کبھی طاقت آتی ہے۔“

گوشت کھانے کی تائید میں یہ ساری دلیلیں ایک ہی نشست میں پیش نہیں کی گئیں۔ یہ اس طول طویل استدلال کا خلاصہ ہے جس سے میرا دوست مجھ پر وقتاً فوقتاً اثر ڈالتا رہا۔ میرے منجھلے بھائی پہلے ہی مغلوب ہو چکے تھے۔ اس لیے وہ میرے دوست کی دلیلوں کی تائید کرتے تھے۔ میں واقعی اپنے بھائی اور اس دوست کے مقابلے میں بالکل مریل معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ قوی اور جفاکش بھی تھے اور جری بھی۔ اس دوست کے کارناموں نے مجھ پر جادو سا کر دیا۔ وہ بہت دور تک اور بڑی تیزی سے دوڑ سکتا تھا، کود پھانڈ میں مشاق اور سخت سے سخت جسمانی سزا برداشت کر لیتا تھا۔ وہ مجھے اکثر اپنے کارنامے دکھایا کرتا تھا اور یہ قاعدے کی بات ہے کہ انسان دوسروں میں وہ صفیتیں دیکھ کر جو اس میں نہ ہوں، دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کے بعد میرے دل میں ولولہ اٹھا کہ اس کے جیسا بنوں۔ میں نہ دوڑ سکتا تھا، نہ دوڑ سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی اس کی طرح مضبوط کیوں نہ ہو جاؤں؟

پھر میں بزدل بھی تھا۔ مجھے ہر وقت چوروں، بھوتوں اور سانپوں کا کھٹکا رہتا تھا۔ رات کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اندھیرے سے میری روح فنا ہوتی تھی۔ میرے لیے اندھیرے میں سونا تقریباً ناممکن تھا، کیوں کہ مجھے وہم ہوتا تھا کہ ایک طرف سے بھوت چلے آ رہے ہیں، دوسری طرف سے چور، تیسری طرف سے سانپ، بغیر کمرے میں روشنی رکھے مجھے سوتے نہ بنتا تھا۔ میں اپنے خوف کو اپنی کمسن بیوی پر کیوں کر ظاہر کرتا؟ میں جانتا تھا کہ ان میں مجھ سے زیادہ ہمت ہے اور مجھے اپنے اوپر شرم آتی تھی۔ انھیں سانپوں اور بھوتوں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ وہ اندھیرے میں ہر جگہ چلی جاتی تھیں۔ میرے دوست کو میری ان کمزوریوں کا حال معلوم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں زندہ سانپ ہاتھ پر رکھ سکتا ہوں۔ چوروں کا مقابلہ کر سکتا ہوں اور بھوتوں کا قائل ہی نہیں ہوں۔ یہ گوشت کھانے کی برکت ہے۔

ان سب باتوں کا مجھ پر کافی اثر پڑا۔ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ گوشت کھانا اچھا ہے اس سے مجھ میں قوت اور جرأت پیدا ہو جائے گی اور اگر سارا ملک گوشت کھانے لگے تو انگریز مغلوب ہو جائیں گے۔

اب تجربہ شروع کرنے کے لیے ایک دن مقرر ہوا۔ اسے پوشیدہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ سارا گاندھی خاندان ویشنو تھا اور میرے والدین تو بڑے پکے ویشنو تھے۔ وہ پابندی سے ”حویلی“ جایا کرتے تھے، بلکہ خود ہمارے خاندان کے جدا گانہ مندر بھی تھے۔ جین مت کا گجرات میں بہت زور تھا اس کا اثر ہر وقت ہر جگہ نظر آتا تھا۔ گجرات کے جین اور ویشنو لوگوں کو گوشت کھانے سے جتنی سخت نفرت تھی اس کی مثال نہ ہندوستان میں ملتی ہے اور نہ کسی اور ملک میں۔ میری ولادت اور پرورش اس ماحول میں ہوئی تھی اور مجھے اپنے والدین سے بڑی محبت تھی۔ میں جانتا تھا کہ جس دم وہ میرے گوشت کھانے کی خبر سن پائیں گے، صدمے کے مارے مرجائیں گے۔ سچائی کی محبت نے مجھے اور بھی زیادہ احتیاط پر مجبور کر دیا۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اس وقت اس کا احساس نہ تھا کہ اگر میں نے گوشت کھانا شروع کر دیا تو والدین کو دھوکا دینا پڑے گا، لیکن میں نے دل میں ٹھان لی کہ ”ریفارم“ ضرور کروں گا۔ اس میں زبان کی چاٹ کو دخل نہ تھا۔ میں نے گوشت کے مزے کی کوئی خاص تعریف نہیں سنی تھی، مگر میں چاہتا تھا کہ میں قوی اور بہادر ہو جاؤں اور میرے دیس کے لوگ بھی ایسے ہی ہو جائیں تاکہ ہم انگریزوں کو شکست دیں اور ہندوستان کو آزاد کرالیں۔ ”سوراج“ کا لفظ میں نے اب تک نہیں سنا تھا، مگر آزادی کے معنی جانتا تھا۔ ”ریفارم“ کے جوش نے مجھے اندھا کر دیا۔ میں نے اس بات کو مخفی رکھنے کا بندوبست کیا، اور اپنے دل کو سمجھا لیا کہ محض اس فعل کو والدین سے چھپانا حق سے انحراف نہیں ہے۔

آخر وہ دن آ گیا۔ اس وقت میرا جو حال تھا اسے پوری طرح بیان کرنا مشکل ہے۔ ایک طرف تو ”ریفارم“ کا جوش اور زندگی میں ایک اہم تبدیلی کی جدت کا لطف تھا اور دوسری طرف اسی کام کو چوروں کی طرح چھپ کر کرنے کی شرم تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا دونوں میں سے کون سی چیز مجھ پر غالب تھی۔ ہم نے دریا کے کنارے جا کر ایک گوشہ تنہائی ڈھونڈا اور میں نے اپنی عمر میں پہلی بار گوشت دیکھا۔ اس کے ساتھ توری روٹی بھی تھی۔ مجھے دونوں چیزوں میں سے کوئی چیز پسند نہ آئی۔ بکری کا گوشت چمڑے کی طرح سخت تھا مجھ سے کسی طرح نہیں کھایا جاتا تھا۔ مجھے تے ہو گئی اور کھانا چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔

اس کے بعد کی رات بڑی بری طرح گزری۔ مجھے بڑا ہولناک خواب نظر آیا۔ جب آنکھ لگتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندہ بکری میرے پیٹ کے اندر مہیا رہی ہے اور میں گھبرا کر اچھل پڑتا تھا۔ مگر میں اپنے دل کو سمجھاتا تھا کہ گوشت کا کھانا فرض ہے اور اس سے مجھے کچھ تسکین ہو جاتی تھی۔

میرا دوست آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ اب عمدہ مسالے ڈال کر گوشت کے مزیدار کھانے پکانے لگا۔ کھانا کھانے کے لیے ہمیں ایک دریا کے کنارے سوئی جگہ ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ریاست کے مکان میں کھاتے تھے جس میں کھانے کا علاحدہ کمرہ میز کرسی سے سجا ہوا تھا۔ میرے دوست نے وہاں کے بڑے باورچی سے ساز باز کر کے یہ انتظام کیا تھا۔

میں اس لالچ میں آ گیا۔ مجھے بوٹی سے کراہت تھی وہ دور ہو گئی۔ بکری پرتس آتا تھا وہ جاتا رہا اور اب گوشت کی بوٹی میں تو نہیں مگر سالن میں مزا آنے لگا۔ یہ سلسلہ قریب قریب ایک سال تک چلتا رہا، لیکن اس عرصہ میں گوشت کی دعوتیں سب ملا کر پچھے سے زیادہ نہیں ہوئیں، کیوں کہ ریاست کا مکان روز روز نہیں ملتا تھا اور پھر یہ وقت بھی تھی کہ مزیدار کھانوں میں اکثر صرفہ بہت ہوتا تھا۔ میرے پاس اس ریفارم کی قیمت ادا کرنے کے لیے دام نہ تھے اس لیے ہر مرتبہ خرچ کا انتظام میرے دوست ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے اتنا روپیہ لاتا ہے مگر کسی نہ کسی طرح وہ لے ہی آتا تھا، کیوں کہ وہ اس پر تلا ہوا تھا کہ مجھے گوشت کھانے کا عادی کر دے۔ مگر آخر اس کی آمدنی بھی محدود ہی ہوگی، اس لیے بہت کم دعوتیں ہو سکیں اور وہ بھی طویل وقفوں کے بعد۔

جب کبھی میں یہ چوری کی دعوتیں اڑاتا تھا تو ظاہر ہے کہ گھر آ کر کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ میری والدہ قدرتی طور پر کھانے کے لیے اصرار کرتی تھیں اور خواہش نہ ہونے کا سبب پوچھتی تھیں۔ میں ان سے کہہ دیتا تھا۔ ”آج مجھے بھوک نہیں ہے۔ میرے ہانصے میں کچھ خرابی ہے۔“ یہ بہانے کرنے پر میرا دل مجھے ملامت کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جھوٹ بول رہا ہوں اور وہ بھی اپنی والدہ سے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر میرے باپ کو میرے گوشت کھانے کی خبر ہو گئی تو انھیں بہت سخت صدمہ ہوگا۔ یہ خیال میرے لیے سوا ہاں روح تھا۔

اس لیے میں نے اپنے دل میں کہا۔ ”اگرچہ گوشت کھانا بہت ضروری چیز ہے اور یہ بھی بہت ضروری ہے کہ ملک میں غذا کی اصلاح کی جائے، لیکن اپنے ماں باپ کو دھوکا دینا اور ان سے جھوٹ بولنا گوشت نہ کھانے سے بھی بدتر ہے۔ جب تک وہ زندہ ہیں گوشت کھانا ممکن نہیں جب وہ نہ رہیں گے اور میں آزاد ہو جاؤں گا تو کھلم کھلا گوشت کھاؤں گا لیکن میں اس وقت تک اس سے پرہیز کروں گا۔ اس پر خلوص خواہش کی وجہ سے کہ اپنے والدین سے جھوٹ نہ بولوں میں نے گوشت چھوڑ دیا مگر اپنے دوست کی صحبت نہ چھوڑی۔ اس کی اصلاح کرنے کے جوش نے مجھے برباد کر دیا تھا، مگر مجھے اس کا بالکل احساس نہ تھا۔

مجھے ابھی اپنی چند اور لغزشوں کا ذکر کرنا ہے جو گوشت کھانے کے زمانے میں اور اس سے پہلے مجھ سے سرزد ہوئیں۔ ان کا سلسلہ میری شادی کے وقت سے یا اس کے تھوڑے ہی دن بعد شروع ہوتا ہے۔

میرے ایک عزیز کو اور مجھے سگریٹ پینے کا چرکا لگ گیا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم اس عادت کو اچھا سمجھتے ہوں یا سگریٹ کی

خوشبو پر مجھے ہوں۔ ہمیں تو صرف منہ سے دھواں نکالنے میں ایک خیالی لطف آتا تھا۔ میرے بچا اس کے عادی تھے اور جب ہم انھیں سگریٹ پیتے دیکھتے تھے تو ہمارا جی چاہتا تھا کہ اُن کی طرح ہم بھی پیئیں۔ مگر ہمارے پاس دام تو تھے نہیں اس لیے ہم نے ابتدا اس طرح کی کہ ہم سگریٹ کے ٹکڑے جو ہمارے چچا پی کر پھینک دیتے تھے چُرا لاتے تھے۔

مگر یہ ٹکڑے ہر وقت نہیں مل سکتے تھے اور ان سے دھواں بھی زیادہ نہیں نکلتا تھا۔ اس لیے ہم نے نوکروں کے جیب خرچ میں سے پیسے چرانا شروع کیے کہ ہندوستانی سگریٹ خریدیں مگر مصیبت یہ تھی کہ انھیں رکھیں کہاں، کیوں کہ ظاہر ہے کہ ہم بڑوں کے سامنے تو سگریٹ پی نہیں سکتے تھے۔ چند ہفتے تک تو ہم کسی نہ کسی طرح ان چرائے ہوئے پیسوں سے کام چلاتے رہے۔ اس عرصے میں ہم نے سنا کہ ایک درخت کی ڈال میں مسامات ہوتے ہیں اور اس کے ٹکڑے سگریٹ کی طرح پیے جاسکتے ہیں۔ ہم انھیں لے آئے اور پینا شروع کر دیا۔

لیکن ان چیزوں سے ہماری تسلی نہ ہوتی تھی۔ آزادی نہ ہونا ہمیں کھلنے لگا۔ ہم سے یہ برداشت نہ ہوتا تھا کہ ہم بغیر بڑوں کی اجازت کے کچھ نہ کر سکیں۔ آخر زندگی سے متنفر ہو کر ہم نے خودکشی کی ٹھان لی۔

مگر اب یہ سوال تھا کہ خودکشی کیسے کی جائے؟ زہر کھائیں تو زہر کہاں سے لائیں؟ ہم سے کسی نے کہا کہ دھتورے کے بیج زہر قاتل ہیں۔ ہم دوڑے ہوئے جنگل میں گئے اور بیج لے آئے۔ ہم نے شام کے وقت کو اس کام کے لیے مبارک سمجھا۔ ہم ”کیدارجی مندر“ میں گئے۔ وہاں کے چراغ میں گھی ڈالا۔ ”درشن“ لیے اور کوئی سونی جگہ ڈھونڈنے لگے۔ مگر ہماری ہمت نے جواب دے دیا۔ فرض کرو کہ ہم فوراً نہ مرے! اور آخر مرنے سے فائدہ ہی کیا؟ آزادی نہیں ہے تو نہ سہی، اسی حالت کو کیوں نہ برداشت کریں؟ پھر بھی ہم دو تین بیج نگل ہی گئے۔ ہم دونوں موت سے ڈر گئے اور ہم نے طے کیا کہ ”رام جی مندر“ جا کر حواس درست کریں اور خودکشی کا خیال چھوڑ دیں۔

مجھے معلوم ہو گیا کہ خودکشی کرنا اتنا سہل نہیں جتنا اس کا ارادہ کرنا اور اس دن سے جب کبھی میں سنتا ہوں کہ فلاں شخص خودکشی کی دھمکی دے رہا ہے تو مجھ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔

خودکشی کے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں نے سگریٹ کے ٹکڑے پینا اور سگریٹ کے لیے نوکروں کے پیسے چرانا چھوڑ دیا۔ جب سے میں بالغ ہوا ہوں مجھے کبھی تمباکو پینے کی خواہش نہیں ہوئی، اور میں اس عادت کو تہذیب کے خلاف، صفائی کے خلاف اور مُضر سمجھتا ہوں۔ یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہ آئی کہ ساری دنیا میں لوگ تمباکو پینے پر کیوں جان دیتے ہیں۔ مجھ سے تو ریل کے ڈبے میں جہاں تمباکو پینے والے بھرے ہوں نہیں بیٹھا جاتا۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔

لیکن اس سے کہیں بڑی چوری کا میں کچھ دن بعد مرتکب ہوا جب میں نے پیسے چرائے تو میری عمر بارہ تیرہ سال کی بلکہ اس سے بھی کم تھی۔ دوسری چوری کے وقت میں پندرہ برس کا تھا۔ اس بار میں نے اپنے گوشت کھانے والے بھائی کے بازو بند سے ایک سونے کا ٹکڑا چرایا۔ یہ بھائی پچیس روپے کے مقروض تھے۔ وہ بازو پر خالص سونے کا بازو بند باندھا کرتے تھے۔ اس میں سے ایک ٹکڑا کاٹ لینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

چنانچہ ایسا کیا گیا اور قرض ادا ہو گیا، لیکن اتنا سنگین جرم تھا کہ مجھ سے کسی طرح برداشت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے عہد کر لیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا۔ میرا یہ بھی ارادہ ہوا کہ اپنے والد کے سامنے جرم کا اعتراف کر لوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ مجھے والد کے ہاتھ سے مار کھانے کا ڈر ہو۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے ہم لوگوں کو کبھی نہیں مارا۔ خوف تھا تو یہ کہ انھیں بہت ڈکھ ہوگا۔

آخر میں یہ فیصلہ کیا کہ میں اعتراف نامہ لکھ کر اپنے والد کو دوں اور ان سے معافی کی درخواست کروں۔ میں نے سارا واقعہ ایک کاغذ پر لکھا اور خود لے جا کر انھیں دیا۔ اس رقعے میں میں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ مجھے اس کی کافی سزا دی جائے اور آخر میں ان سے درخواست کی کہ میرے قصور کے بدلے وہ اپنا دل نہ کڑھائیں۔ میں نے اس بات کا عہد کیا کہ پھر کبھی چوری نہ کروں گا۔

میں نے اعتراف نامہ انھیں دیا تو میں کانپ رہا تھا۔ وہ ان دنوں ناسور میں مبتلا تھے اور صاحب فرماش تھے۔ ایک کھڑے تخت پر لیٹے رہتے تھے۔ میں نے رقعہ انہیں دے دیا اور چوکی کے سامنے بیٹھ گیا۔

انھوں نے اسے اوّل سے آخر تک پڑھا اور موتیوں کے قطرے ٹپ ٹپ اُن کے رخساروں پر اور کاغذ پر گرنے لگے۔ دم بھر وہ آنکھیں بند کر کے سوچتے رہے اس کے بعد انہوں نے رقعہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ اسے پڑھنے کے لیے پہلے بیٹھ گئے تھے اب وہ پھر لیٹ گئے۔ میں بھی رونے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ انھیں کیسا ڈکھ ہے۔ اگر میں نقاش ہوتا تو آج اتنے دن کے بعد بھی پورے منظر کی تصویر کھینچ دیتا۔ اس واقعہ کی یاد میرے دل میں اب تک تازہ ہے۔

ان محبت کے موتیوں نے میرے دل کو پاک کر دیا اور میرے گناہ کو دھو ڈالا۔ اس محبت کو وہی خوب جانتا ہے جس نے اس کا لطف اٹھایا ہے۔

یہ میرے لیے 'اہمسا' کا عملی سبق تھا۔ اس وقت تو مجھے اس میں سوائے باپ کی محبت کے کچھ نظر نہ آتا تھا، مگر آج میں جانتا ہوں کہ یہ خالص 'اہمسا' تھا۔ جب یہ 'اہمسا' ہمہ گیر ہو جاتا ہے تو جس چیز کو چھوٹا ہے اس کی کاپلٹ دیتا ہے۔ اس کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔

اس طرح کا شاندار عفو میرے والد کی طبیعت سے بعید تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خفا ہو جائیں گے، سر پھینک لیں گے۔ مجھے سخت سُست کہیں گے۔ لیکن ان کا سکون دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے صاف صاف اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا۔ گناہ کا پورا اعتراف اور آئندہ اس سے باز رہنے کا عہد، ایسے شخص کے سامنے جو انہیں قبول کرنے کا اہل ہے، تو بہ کی خالص ترین صورت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف سے والد کو میری طرف سے پورا اطمینان ہو گیا اور انہیں مجھ سے جو محبت تھی وہ بے انتہا بڑھ گئی۔

— مترجم : سید عابد حسین

مشق

لفظ و معنی :

گناہ یا قصور کا بدلہ جو قصور وار کی طرف سے ادا ہو	:	کفارہ
دلی دوست، بہت قریبی دوست	:	قلبی دوست
خبردار کیا، آگاہ کیا	:	مُنتبہ کیا
کسی قصور یا کمی کی صفائی کے طور پر جو بات کہی جائے	:	عذر معذرت
پریشانی، الجھن	:	تردّد
وجہ بیان کرنا، دلیل دینا	:	توجیہ
انتہائی دوستی، گویا جسم دو ہیں لیکن جان ایک	:	ایک جان دو قالب
ہندوؤں کا ایک فرقہ جو گوشت، پیاز، لہسن وغیرہ سے سخت پرہیز کرتا ہے	:	ویشنو
بڑا مکان، یہاں پر عبادت گاہ کے لیے استعمال ہوا ہے	:	حویلی
سازش، گٹھ جوڑ	:	ساز باز
رُوح کو تکلیف دینے والا	:	سواہن روح
غلطی، بھول چوک، گمراہی	:	غزش
جلد کے باریک سوراخ جن سے پسینہ نکلتا ہے	:	مسامات

زہر قاتل	:	وہ زہر جس کے کھانے سے انسان مر جائے، مہلک زہر
مرتب	:	کام میں ہاتھ ڈالنا، قصور وار
صاحبِ فراش	:	وہ بیمار جو بستر سے نہ اُٹھ سکے
اہمسا	:	اہنسا، خون خرابے اور توڑ پھوڑ میں یقین نہ رکھنا یا ان باتوں پر عمل نہ کرنا، عدم تشدد
ہمہ گیر	:	جو سب پر چھایا ہو
عفو	:	معافی، درگزر

غور کرنے کی بات:

- یہ مضمون مہاتما گاندھی کی آپ بیتی My Experiments With Truth کے اردو ترجمے ”تلاشِ حق“ سے لیا گیا ہے۔ مضمون پڑھتے وقت آپ کو کسی بھی سطر پر یہ شبہ نہیں ہوگا کہ یہ ترجمہ ہے۔ اچھے اور کامیاب ترجمے کی یہی خوبی ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہو۔
- مہاتما گاندھی نے اپنی سوانح لکھتے وقت اپنی شخصی کمزوریوں کو چھپایا نہیں ان پر کسی طرح کا پردہ نہیں ڈالا اور کھلے دل سے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور خود ہی اپنی اصلاح کی۔ ایک اچھی آپ بیتی کی پہلی خوبی یہی ہے کہ اس میں کسی طرح کا تصنع نہ ہو۔ اس طرح کی آپ بیتیاں پڑھنے والے کے لیے لطف کے ساتھ ساتھ عبرت اور اصلاح کے مواقع بھی فراہم کرتی ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے:

- 1- ”انسان پر بہ نسبت نیکی کے بدی کا اثر جلد پڑتا ہے“، ایسا کیوں؟ واضح کیجیے۔
- 2- مہاتما گاندھی نے اپنی غلطیوں کے کفارے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا؟
- 3- گاندھی جی کا اعتراف نامہ پڑھ کر ان کے والد پر کیا اثر ہوا؟

عملی کام:

- ایک مضمون لکھیے۔ ”چوری ایک بری عادت ہے۔“
- گاندھی جی کی زندگی سے متعلق کتابیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیجیے۔